"مجھ سے نہیں اچھی روح . . . میں پہلے ہی کسی اور سے محبت کرتا ہوں ۔ ان تینوں میں سے ۔" غازی نے باقی تین لڑکوں کی طرف اشارہ کر کے سوال کیا ۔

گلاس آہستہ آہستہ چاروں طرف گھومنے لگا ۔ گول گول چکر . . . ادھ کٹی قوسیں . . . نصف قطر بنانے لگا ۔

بتاؤ، بتاؤ، روح اچھی روح سچ سچ بتاؤ !"

ظفر نے منہ پرے کر لیا ۔ نئی لڑکی کو یوں تختۂ مشق بنانا اسے کچھ اچھا نہ لگا ۔ اس نے سگرٹوں کی ڈبیا اٹھائی اور جلدی سے بولا ۔

"اچھا بھئی سولانگ ۔ ہم تو چلے ۔"

"رکو، رکو ! ابھی مس ڈسپل کے متعلق سوالات ہونگے ۔"

"نو تھینک یو ! مجھے کچھ انتظامات کرنے ہیں پکنک کے سلسلے میں . . ." وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتا باہر چلا گیا ۔

کمرے میں پلانچیٹ کے گرد بیٹھے لڑکوں نے اونچا سا قہقہہ لگایا اور پھر کمرے پر مکمل خاموشی چھا گئی ۔

جب کئی رشیدہ میر جب پہلا دن کالج میں گزار کر گھر پہنچی تو خالہ فیروزہ باہر برآمدے میں بیٹھی ایک پرانا سویٹر ادھیڑ رہی تھیں ۔ انوری جیچاں لاکھ جیسے سرخ ہونٹ لاڈ سے کھولے ان کے سر میں تیل ڈال رہی تھی ۔ پاس والی کرسی پہ خالو جمال آنکھوں پر عینک لگائے صبح کا اخبار پڑھنے میں مشغول تھے ۔ ان کا معمول تھا کہ صبح ناشتہ کے

وقت اخبار کی سرخیاں دیکھ لیتے، اور دوپہر کو پہلے صفحے پر بکرمی سن اور ہجری سن سے لیکر آخری صفحے کی پرنٹ لائن تک سب کچھ توجہ، انہماک اور یورش سے پڑھتے۔ کچھ خبریں وہ اپنی بیوی سے گفتگو کرنے کی خاطر پڑھا کرتے تھے۔ فلم کے اشتہاروں کا صفحہ، قتل، اغوا کی خبریں، جائدادوں کی خرید و فروخت کی تفصیل، ڈاکہ، رہزنی، دلکیتی، بنکوں کی لوٹ مار کی واردات کا بیان اسی ضرورت کے تحت آتا تھا۔ کھیلوں کا صفحہ گو ان کے کسی کام نہ آتا تھا، لیکن یادِ ماضی سے اسکی کڑی ضرور ملتی تھی۔ ایک زمانے میں جب وہ اسلامیہ کالج میں پڑھتے تھے، اور محض اس وجہ سے ان کو داخلہ ملا تھا کہ وہ کرکٹ خوب کھیلتے تھے۔ انہیں کھیلوں سے بہت دلچسپی تھی۔ ان کے پاس کئی ایسی کتابیں موجود تھیں جن میں ننگ دھڑنگ مرد صرف جانگیہ پہنے مچھلیاں پنڈلیاں نکالے، پیٹ میں ہزار ہزار ہر قسم کے مسل نکالے گردن کو بل دیئے، سینے کی وی بنائے موجود تھے۔

پی سی ایس کرنے سے پہلے خالو جمال کو ان تصویروں سے عشق تھا۔ پھر ان کا مقابلہ ایک ہندو لڑکے پرشوتم سے ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ جوڈو باکسنگ باڈی بلڈنگ، کرکٹ وغیرہ زندگی سے نکل گئی۔ آنکھوں پہ عینک آن بیٹھی، معدے میں تخیر رہنے لگا۔ گفتگو میں کتابی پن آگیا۔ اور وہ پی سی ایس ہو گئے۔ پرانے دنوں سے یہ ہلکا سا رشتہ اب بھی باقی تھا کہ وہ کھیلوں کا صفحہ دیکھ کر، اور کھلاڑیوں کی کارکردگی تفصیل سے پڑھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔

ایڈیٹر کے خطوط اور سیاسی حالات دفتری لوگوں سے بات چیت کرنے کے کام آتے تھے۔ سٹاک ایکسچینج اور بلین مارکیٹ کی رپورٹ، بازار کے بھاؤ، ٹرین اور ہوائی جہازوں کی آمد اور روانگی کی خبریں اس لئے ضروری تھیں کہ اس سے ان کی برتری ظاہر ہوتی تھی۔

ریڈیو کے پروگرام البتہ انہیں ناپسند تھے۔ اسکی وجہ کچھ یہ بھی تھی کہ ریڈیو پروگراموں کے متعلق چاہے ان کی معلومات کتنی بھی وسیع کیوں نہ ہوتیں وہ اپنی بیٹی تنویر کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے تنویر کو تو روشن آرا، ثریا ملتانیکر، فریدہ خانم، اقبال بانو، اسے شکورا، منور سلطانہ، جمیلہ اختر سلطان کھوسٹ وغیرہ کی ساری ساری ہسٹریاں معلوم تھیں۔ ان کے تعدد ازدواج، رہائش گاہوں کے پتے اور رشتہ داروں، دوستوں تک کے نام آتے تھے۔ یہاں بھلا خالد جمال کی دال کیا گلتی؟

اخبار کے علاوہ خالد کو اپنے کام سے دلچسپی تھی اور بس!

جب سے وہ انٹی کرپشن میں آئے تھے چوک کے سنتری سے لیکر منسٹروں تک اور پرانے آئی سی ایس قسم کے مقتدر افسروں سے لے کر معمولی چپڑاسیوں تک کو ایک ہی رسی سے پھانسی دیتے تھے جو فائل ان کے پاس پہنچ جاتی، ماؤنٹ ایورسٹ تلے دب جاتی پھر کوئی سفارش، کوئی لالچ، کسی قسم کا سیاسی دباؤ، کسی نوعیت کی حیلہ سازی ان کا فیصلہ نہ بدل سکتی۔ رپورٹ ہمیشہ وہی ہوتی جس پر خالد جمال کی چھٹی حس کا پختہ اعتقاد ہوتا۔

کرپشن کے بھی ازل سے کئی روپ ہیں۔ اور اس کے ہر روپ کا فلسفہ بھی ہر عہد میں بدلتا رہتا ہے فلسفہ چاہے کچھ بھی ہو مجبوری چاہے کچھ بھی کہے اتنی بات ضرور طے

ہے کہ ہر عہد میں کرپشن آفیسر سے صاف گوئی کی توقع کی جاتی رہی ہے۔ اور خالو جمال دفتر میں بہت صاف گو اور معاملے کے کھرے سمجھے جاتے تھے۔

کورپشن کا محکمہ لاہور میں بہت پرانا تھا۔ مہاراجہ رام چندر کے سپوت لو پوتے جب لاہور کی بستی بسائی، اور سورج بنسی راجاؤں کا نام اس شہر کے ساتھ جوڑ کر امر کیا تو خود راجہ لو کے پتا مہاراجہ رام چندر کی سروس بک پر کرپشن کا دھبہ لگ چکا تھا۔ مہاراجہ رام جو بڑے دیالو سور بیر ستیہ وان تھے۔ اور جن سے پہلے ستاون راجہ بڑے بڑے جوان ہندوستان کی گدی پر پورے دو ہزار برس راج کر چکے تھے۔

مہاراجہ رام جنہوں نے بعد میں اشومیدھ یگ کیا، اور مہارانی سیتا کی سونے کی مورتی بنا کر گدی پہ رکھی کہ مہارانی کا سمبل بھی قائم رہے۔ اور انہیں دوسری شادی بھی نہ کرنی پڑے۔ مہاراج رام کو اسی جیتی کو اس وقت گھر سے نکالنا پڑا، جب مہارانی گھر پروتی تھی۔ اور لو اور کشو اس کے توام بچے جو اس وقت پیٹ میں تھے بلاقصور جلاوطن کر دیئے گئے۔

کورپشن آفیسر دھوبی نے اپنی دھوبن سے کہا تھا۔

"جاری جا نیہ لگائے دو جوں سنگ۔ اور رہے دھوبی کی جورو را۔۔ ایں راجہ رام نہیں ہیں کہ لی لیں سنگل دیپ کے راجہ سنگ مو جے بہار دیکھی آوے، اور رہے ستہ وتی سیتا۔۔ جاری جا۔"

کہتے ہیں کہ مہاراجہ رام پر طعنے کے اس نکھو نکھے تیر کا ایسا اثر ہوا۔ کہ فوراً راجہ لچھمن کے

ساتھ مہارانی کو بن باس دیا۔ (یہ کنور لچھمن ہر بن باس میں بڑے اہم رہے۔ اللہ جانے انہیں رامچندر کا زیادہ پاس تھا کہ ستی سیتا کا ؟)

اُن دنوں رِٹ کرنے کا رواج نہ تھا ورنہ دھوبی ضرور زد میں آجاتا۔ ہو سکتا ہے۔ مہاراجہ رام چندر بھی خود دھوبی کے ہم خیال ہوں۔ اور یہ دھوبی محض آڑ کے طور پر استعمال کیا گیا ہو۔ انہوں نے مہارانی پر بد چلنی کا دھبہ لگاتے ہوئے کہا۔

"ستی ! یہ تو اد فتنے میں جانتا ہوں کہ تو ہمالہ کی برف سے بھی پوتر ہے۔ گنگا جل سے بھی ادھک پوجیئے یوگ ہے۔ پرنتو پرتیے جو بات دھوبیوں تک پہنچ چکی ہے۔ اس کو میں راجہ رام کیسے جھٹلا سکتا ہوں۔"

شاید ان دنوں دھوبی اتنی بڑی سیاسی جماعت کے لیڈر تھے کہ ان کی بات ادھر منہ سے نکلی، ادھر پوری ہوئی۔ خدا جانے گھپلا کیا تھا۔ اتنی بات واضح ہے کہ مہارانی سیتا کو مہاراج رام نے بن باس دیا۔ مہارانی کو چھوڑنے کنور لچھمن ساتھ گئے۔ . . . اور کرپشن آفیسر دھوبی نے بہت بڑا کیس جیت لیا۔

ویسے بھی سنا ہے کہ سوڈا کاسٹک استعمال کرنے والوں کا جبلّی طور پر تزکیہ نفس کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اسی لئے جب مسیح علیہ السّلام نے اپنی زندگی میں پہلا وعظ دیا تو یہ دھوبیوں سے مخاطب تھا۔

خالو جمال کا دھوبیوں سے کتنا گہرا تعلق تھا، اس کے متعلق تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ان کے نام کی تختی جو پھاٹک کے کونے پر نصب تھی اس پر لکھا تھا۔

"جمال اظہر بخاری"

بخاری صاحب کا شجرۂ نسب وہ [illegible] تک صاف ستھرا پیڑھی در پیڑھی [illegible]
لیکن کچھ لوگوں نے یہ تخریج نکال رکھی تھی کہ سبکتگین نہ بخاری تھا نہ ہاشمی . . . ممکن ہے یہ
الزام تراشی انہوں نے کی ہو جو جمال اظہر صاحب کے ہاتھوں زخم خوردہ ہوں۔ بہر کیف اعتراض
کرنے والوں کا خیال تھا کہ بخاری بننے کا بخار انہیں سن سینتالیس کے بعد چڑھا۔ واللہ
اعلم بالصواب۔

جس وقت رشیدہ گھر پہنچی اس وقت خالو جمال باآواز بلند اخبار پڑھ کر خالہ فیروزہ
کو سنا رہے تھے۔

"میرا بیٹا، زبیر خان، جو میرے ہی مکان کے ایک حصے میں رہتا ہے۔ بوجہ آوارگی
و دیگر حرکات کی بنا پر میں نے اس کا کھانا پینا بول چال بالکل بند کر دی ہے۔ میں اس کے
کسی قول و فعل کا ذمہ دار نہ ہونگا۔"

محمد حیات خان، بیر نام سنگھ بلڈنگ، قلعہ گوجر سنگھ لاہور۔

انوری کے ہاتھوں کی جنبش میں خالہ فیروزہ کا سر آگے پیچھے ہچکولے لے رہا تھا۔
یہ عاق نامے کی خبر سنتے ہی وہ بولیں۔

"توبہ! بعد میں جو یہ لوگ عاق کرتے پھرتے ہیں تو پہلے ہی اولاد کی خبر گیری کر لیا
کریں!!"

"سب تمہاری طرح اولاد کے دیوانے نہیں ہوتے۔"

خالو جمال اپنی بیوی کے بڑے مداح تھے۔ ان کی گھرداری اور بچوں کی تربیت سے لے کر نوکروں کی دیکھ بھال سب انتظامات سے خالو جمال کو کلی اتفاق تھا۔

"بے وقت بڑھاپا بھی آگیا ان بچوں کی فکروں میں۔ پرسوں انارکلی میں مسز عبدالباری ملی تھیں۔ خدا قسم مجھ سے سکول میں تین سال آگے تھیں۔ اور اب مجھ سے دس سال چھوٹی لگتی ہیں۔"

"فیصلہ کرلو۔ جوانی درکار ہے کہ اچھی نیک چلن اولاد۔۔۔"

خالہ فیروزہ نے لمبی سانس بھری۔ درکار تو انہیں دونوں چیزیں تھیں، لیکن عجیب بات یہ تھی کہ نصیب میں دونوں چیزیں نہ تھیں۔ ریشمی کپڑا، زیور اعلیٰ سے اعلیٰ جوتیاں، ہر طرح کی میک اپ، کوئی چیز بھی بڑھاپے کی باڑھ روکنے میں کامیاب نہ تھی ادھر اولاد کا نقشہ بھی دن پر دن بگڑتا ہی جارہا تھا۔

دو بچے تھے، تنویر اور ریاض۔ لیکن یوں سمجھئے کہ بے لگام رہوار پر آسن جمائے بیٹھے تھے۔

پہلے تو ریاض کے دوست کالج سے ساتھ آتے تھے، اور وہ پہروں پھاٹک پر کھڑا ان سے باتیں کرتا تھا۔ پھر جو خالہ فیروزہ نے روک ٹوک کی تو وہ باہر جانے لگا اور دوسروں کے پھاٹکوں کے آگے کھڑا رہنے لگا۔ اس سے دوسری قباحتیں نکلیں۔ ان قباحتوں کی بھنک گو ابھی تک خالو جمال تک نہ پہنچی تھی لیکن اندر ہی اندر سڑے سیب کی مانند خالہ فیروزہ کا دل پک گیا تھا۔

رشیدہ ہاتھوں میں کتابیں لئے، رومال میں ان پیسوں کو گرہ دیتی آئی جو اسے بس سے اترتے وقت کنڈکٹر نے دیئے تھے۔

"سلام خالو جان۔۔۔ سلام خالہ جی۔۔۔"

"وعلیکم سلام۔ داخلہ مل گیا۔۔" خالو نے پوچھا۔

"جی۔"

"کتنے لڑکے لڑکیاں ہیں کلاس میں؟"

"انیس لڑکے ہیں جی اور چھ لڑکیاں۔"

"دل لگ گیا تمہارا؟"

"جی۔" اس نے یکدم مینڈک کی طرح اچھلتے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کھانا کھالو اندر جا کر رشو۔ رمضان کہاں ہے الوزی۔"

"وہ مرن جوگا تو کسی پنواڑی کی دوکان پر کھڑا ریڈیو سن رہا ہوگا۔" الوزی نے منہ بنا کر کہا۔ "آپ نے اسے سر چڑھا رکھا ہے جی۔"

"نعمت خانے میں کھانا پڑا ہے رشیدہ۔ یہ الوزی ذرا میرے سر میں تیل لگا رہی ہے۔ رات سے سر پھٹا جا رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں خالہ جی۔۔۔ میں آپی کھالوں گی۔"

جب رشو کھانا کھانے چلی تو اسے شدید بھوک لگی تھی، لیکن جب وہ نعمت خانے تک پہنچی اور سلور کی کٹوری میں ٹھنڈا اردی گوشت اور نام چینی کی تھالی میں

خالو جمال اپنی بیوی کے بڑے مداح تھے۔ ان کی گھرداری اور بچوں کی تربیت سے لے کر نوکروں کی دیکھ بھال سب انتظامات سے خالو جمال کو کلی اتفاق تھا۔

بے وقت بڑھاپا بھی آگیا ان بچوں کی فکروں میں۔ پرسوں انارکلی میں مسز عبدالبار ملی تھیں۔ خدا قسم مجھ سے سکول میں تین سال آگے تھیں۔ اور اب مجھ سے دس سال چھوٹی لگتی ہیں۔"

"فیصلہ کرلو۔ جوانی درکار ہے کہ اچھی نیک چلن اولاد۔۔۔"

خالہ فیروزہ نے لمبی سانس بھری۔ درکار تو انہیں دونوں چیزیں تھیں، لیکن عجیب بات یہ تھی کہ نصیب میں دونوں چیزیں نہ تھیں۔ ریشمی کپڑا، زیور اعلیٰ سے اعلیٰ جو تیار ہر طرح کی میک اپ، کوئی چیز بھی بڑھاپے کی باڑھ روکنے میں کامیاب نہ تھی اور اولاد کا نقشہ بھی دن پر دن بگڑتا ہی جارہا تھا۔

دو بچے تھے، تنویر اور ریاض، لیکن یوں سمجھئے کہ بے لگام رہوار پر آسن جمائے بیٹھے تھے۔

پہلے تو ریاض کے دوست کالج سے ساتھ آتے تھے، اور وہ پہروں پھاٹک پر کھڑا ان سے باتیں کرتا تھا۔ پھر جو خالہ فیروزہ نے روک ٹوک کی تو وہ باہر جانے لگا دوسروں کے پھاٹکوں کے آگے کھڑا رہنے لگا۔ اس سے دوسری قباحتیں نکلیں۔ ان قباحتوں کی بھنک گو ابھی تک خالو جمال تک نہ پہنچی تھی لیکن اندر ہی اندر سڑے سیب کی مانند خالہ فیروزہ کا دل پک گیا تھا۔

رشیدہ ہاتھوں میں کتابیں لئے ، رومال میں ان پیسوں کو گرہ دیتی آئی جو اسے بس سے اترتے وقت کنڈکٹر نے دیئے تھے ۔

"سلام خالو جان ۔ ۔ ۔ سلام خالہ جی ۔ ۔ ۔"

"وعلیکم سلام ۔ داخلہ مل گیا ۔ ۔" خالو نے پوچھا ۔

"جی ۔"

"کتنے لڑکے لڑکیاں ہیں کلاس میں ؟"

"انیس لڑکے ہیں جی اور چھ لڑکیاں ۔"

"دل لگ گیا تمہارا ؟"

"جی ۔" اس نے یکدم مینڈک کی طرح اچھلتے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔

"کھانا کھا لو اندر جا کر رشو ۔ رمضان کہاں ہے الوزی ۔"

"وہ مرن جوگا تو کسی پہاڑی کی دوکان پر کھڑا ریڈیو سن رہا ہوگا ۔" الوزی نے منہ بنا کر کہا ۔ "آپ نے اسے سر چڑھا رکھا ہے جی ۔"

"نعمت خانے میں کھانا پڑا ہے رشیدہ ۔ یہ الوزی ذرا میرے سر میں تیل لگا رہی ہے ۔ رات سے سر پھٹا جا رہا ہے ۔"

"کوئی بات نہیں خالہ جی ۔ ۔ ۔ میں آپی کھا لوں گی ۔"

جب رشو کھانا کھانے چلی تو اسے شدید بھوک لگی تھی ، لیکن جب وہ نعمت خانے تک پہنچی اور سلور کی کٹوری میں ٹھنڈا اروی گوشت اور نام چینی کی تھالی میں

سیاہ چتی لگی موٹی موٹی روٹیاں دیکھیں تو نہ جانے کیوں حلق بند ہونے لگا۔ اور ایک ایک لقمہ بمشکل تمام اترنے لگا۔

بہاولپور میں جب وہ کالج سے لوٹتی تو انگیٹھی پر سالن کی دیگچی دھری نظر آتی۔ توا چولہے پر ہوتا۔ ادھر ڈیوڑھی میں اس کا قدم پڑتا اور ادھر امی کی لچکی جیسی نرم نرم روٹی پکا کر چھابے میں دھرتیں۔۔۔ نجانے رشو کی آنکھوں میں کیوں اتنے سارے آنسو آ گئے۔

خالد ضرور سرخ صافی میں اکنی کی برف لایا ہوگا۔ زری اور راشدہ نے سکول کے یونیفارم اتار کر چھینٹ کی قمیصیں پہن لی ہونگی۔ منہ ہاتھ اور پیر دھو کر چھوٹے چھوٹے ربڑ کے سلیپر پہنے ہونگے۔ وہ امی کے پاس چھوٹے چھوٹے مونڈھوں پر بیٹھی ہونگی، آج پھر روغنی بڈی پر ان کی جھڑپ ہوئی ہوگی۔ اور خالد ڈرائینگ کی کاپی اور رنگین پنسلوں کا تقاضا کر رہا ہوگا۔

رشو نے بمشکل تمام ایک روٹی کھائی اور پھر چوروں کی طرح گیلری میں سے گزر کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ سامنے غسلخانے کا دروازہ بند تھا اور ریاض لپک جھپک نہانے میں مصروف تھا۔

رشو نے آنکھیں موند لیں اور پلنگ پر دراز ہو گئی۔ نانی اماں کی یاد نہ جانے کیوں سرپٹ آنے لگی۔ نانی ماں کہا کرتی تھیں کہ جب ان کی شادی ہوئی تو وہ بیاہ کر محمود برقی گئی تھیں جس مکان میں وہ اتریں، وہ دراصل ایک احاطہ تھا۔ ادھر ادھر پانچ گھر تھے، آنگن سب کا سانجھا تھا، گرمیوں میں سب کے چولہے باہر جلتے، سب کے

بچے اکٹھے کھیلتے، کھیلتے، جھگڑتے، اور پھر آپس جاتے۔ کبھی کسی ماں نے اپنے بچے کی طرفداری نہ کی تھی، بچے سب کے آنگن کی طرح سانجھے تھے۔ اسی لئے زندگی بلبل کی طرح ہر وقت چہکتی رہتی تھی۔

ادھر گھروں میں ماسی جیونی کا گھر سب سے الگ تھلگ تھا۔ وہ جب بھی آنگن میں آکر بیٹھتی چارپائی کھڑی کر کے سب سے اوٹ کر لیتی۔ ماسی جیونی بڑی خاموش، وضع دار، اور رکھ رکھاؤ کی عورت تھی۔ ضرور کسی اچھے گھر کی بیٹی تھی، لیکن چاچا دارا نے چکّل اکھاڑ کر جو اس گھر میں لگا دیا تو پھر ماسی جیونی پر ہری ہری کونپلیں نہ نکلیں، شگوفے نہ پھوٹے ویسے تو چار بچے بھی تھے لیکن جیسے چقماق بھیگ چکا ہو۔ بھرے گھر کے باوجود ان کے لب ہنسی کی چنگاریاں نہ چھوڑتے۔ اسی بجھے پن نے آنگن سانجھا ہونے کے باوجود، ماسی جیونی اور باقی احاطے والوں کے درمیان ایک دیوار بنا رکھی تھی۔

بڑی مصیبتوں سے یہ پانی پاٹ کر جب نانی ماں جیونی ماسی کے دل تک پہنچیں تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے دساور پہنچ گئی ہیں۔ یہ تو کائنات ہی اور تھی۔ چاچا دارا کام کاج کا کوڑھی تھا۔ جو رقبہ باپ دادا سے وراثت میں ملا تھا، سو رہن تھا۔ جانے کہاں کاروبار کرتا تھا۔ لیکن اتنی بات ضرور تھی کہ کبھی بھی وہ کنیوں کے تھیلے میں خورد و نوش کا سامان لے آتا تو ماسی جیونی تمام چینی کی تھالیوں میں سوغاتیں سجا سجا کر انہیں ریشمی رومالوں سے ڈھانپتی اور پھر انہیں بچوں کے ہاتھ میں تھما کر نام بنام سب کے گھر بھجواتی۔

ویسے تو ماسی جیونی سے چاچا واراکی کورد بتی تھی۔ لیکن نہ اس قدر کہ یہ خوف انہیں کسی ڈھنگ کے کام پر مستعد ہونے کو ابھارتا۔ محلے کے بزرگ سمجھاتے تو چاچا کہتا۔

"سب کو وہی مالک دیتا ہے . . . پانی میں مچھلی کو، پتھر میں کیڑے کو، ہوا میں پرندے کو . . . سب کو وہی بے پرواہ دیتا ہے۔ وارے کو کیا بھول جائے گا؟ جب دانت نہ تھے تب دودھ دیا، جب دانت دیئے تو کیا اَن نہ دے گا؟"

چاچا کی ایسی باتوں کے سامنے ناصح حضرت کا منہ لٹک جاتا۔ اور وہ نہایت بے اعتقاد، نفرت والا، اور بے توکل نظر آنے لگتا۔ رفتہ رفتہ احاطے والے چاچا ہی کے توکل پر ایمان لے آئے۔ یہ اور بات تھی کہ گرمیوں میں جب سارے چولہے آنگن میں جلنے لگتے تو ماسی جیونی کی جان پر بن آتی۔ شام کو جب سن چھپٹیوں کی آگ چٹاخ پٹاخ شعلے چھوڑتی سارے آنگن میں گرم تھاپیوں کی گوبریلی خوشبو اٹھتی تو ماسی جیونی بھی چارپائی کھڑی کر کے چولہے کے پاس آ بیٹھتی۔ اُسکے بگھار میں سے کچھ ایسی اشتہا انگیز خوشبو اٹھا کرتی تھی کہ حمل والیوں کا جی ذرا کھٹی میٹھی چیزوں کے لئے پھڑک اٹھتا۔

ایک روز نانی اماں اسی بگھار کی خوشبو پر اٹھیں اور سیدھی ماسی جیونی کے چولہے کے پاس جا پیڑھی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔ یہ اتنا بڑا دیگچہ اپلوں پر سوں سوں کر رہا تھا۔

نانی ماں نے ماسی سے پوچھا۔

"ماسی آج کیا چڑھا رکھا ہے۔ تیرے لاڈن سے تو کھانے پر بھی بھوک لگ آتی

ہے۔ پیٹ والے بھی مانگنے لگتے ہیں۔"

ماسی جیونی بولی۔

"کچھ بھی تو نہیں، بچے کتنے دنوں سے کھچڑی کے لیے ضد کر رہے تھے، سو اسی کا بگھار دیا ہے ابھی۔ . . . مہراں کو بہت شوق ہے کھچڑی کا۔"

"کھچڑی کاہے کی ماسی۔ . . . مسر کی کہ مونگ کی؟"

"کل ہی تازہ موٹھ لائے تھے . . . سو وہی ڈالے ہیں۔"

نانی نے ماں کا کہنا تھا کہ اسی لیے امّی کو موٹھ کی کھچڑی اس قدر پسند ہے کیونکہ اس روز ان تک ماسی جیونی کا بگھار جا پہنچا تھا۔

نانی نے ماں اور ماسی جیونی کی باتیں کہیں مہراں نے سن لیں۔ کہاں تو ماسی جیونی تھی کہ اپنے گھر کی باتیں خود اپنے آپ سے نہ کہتی تھی اور کہاں انکی بیٹی مہراں تھی کہ قاصد کبوتر کی طرح ہر گھر کی بات لے اڑتی۔ الٹی مت کی لڑکی کھچڑی کا سن کر بھاگی بھاگی ننھّی میراثن کے ہاں جا پہنچی۔ ننھّی ہر جمعرات کو احاطے میں روٹی لینے آیا کرتی تھی، احاطے والے سبھی اس پر ترس کھاتے تھے۔ لیکن ماسی جیونی کا تو معمول تھا کہ ہر جمعرات کو اندھی میراثن کے لیے ضرور ایک آدھ روٹی پکا چھوڑتی۔ مہراں نے جانے جا کر کیا جڑا کہ بڑا سا سلور کا بیڑھا میڑھا کٹورا اٹھا، لاٹھی ٹیکتی، جھونکتی ہانکتی ننھّی بھی آ پہنچی۔

یہ پہلا دن تھا کہ جیونی کے ہاتھ سے صبر کا پیمانہ چھوٹ گیا۔ پہلے تو اندر لے جا کر مہراں کی کمر میں دو چار دھموکے دیئے، پسلی میں مکیاں رسید کیں، پھر پٹی پر سر رکھ کر

یوں رونے لگی جیسے کوئی مر گیا ہو۔ بڑی دیر ماسی جیونی کا تماشہ نانی ماں کھڑی دیکھتی رہیں۔ جب آنسوؤں کی باڑھ رکی اور ہچکیوں کا تار بندھا تو نانی ماں نے نہایت شفقت سماجت سے اس قہرمانی کی وجہ پوچھی۔ پہلے تو جیونی ٹالتی رہی پھر بولی۔

"دیکھتی نہیں ہو نحتی باہر دیگچے کے پاس بیٹھی ہے۔"

"نحتی؟ . . . پھر کیا ہوا ماسی؟"

"تو اس کو کیا دوں؟ اپنا کلیجہ؟ اس کے کٹورے میں کھجور کی گٹھلیاں کیسے ڈالوں جو اس دیگچے میں پک رہی ہیں۔ گٹھلیوں بھرا دیگچہ کھچڑی بننے سے تو رہا۔"

ابا جان کی وفات پر جب نت نئی تکلیفات ان پہ آنے لگیں تو نانی جان ماسی جیونی کی باتیں سنا سنا کر انہیں دم دلاسہ دیا کرتی تھیں۔

رشیدہ کو آج نہ جانے کیوں ماسی جیونی یاد آرہی تھی جسے اس نے کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔

. . . .

جس روز پکنک تھی، اس روز صبح سے رشیدہ کا دل بجنے لگا تھا۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ خالہ فیروزہ سے اجازت طلب کرتی۔ اور نہ ہی اتنی سکت تھی کہ کلاس میں جانے سے انکار کر دیتی۔ اب بیٹھی سوچتی تھی کہ کالج جائے کہ گھر بیٹھی رہے۔ اسی گوگو کے عالم میں کبھی اس نے بالوں کو چوٹی بنایا اور کبھی چوٹی کھول کر جوڑا باندھا۔ لیکن ہر بار جب وہ آئینہ دیکھتی تو دل بجھ سا جاتا۔ اپنے لمبے لمبے کان بے حد بدوضع

نظر آتے - ان کانوں کا کوئی کیا کرے؟ مہاتما گاندھی کے کانوں کی طرح، ادھ کھلے کواڑ کی مانند چہرے سے پرے پرے، کھڑے تک رہے ہیں - یہ بھی خیال جی کو کھائے جا رہا تھا کہ ادھر کالج کی ساتھنیں ایسا سنگھار کر کے آئیں گی جو بظاہر تو کاٹن کی قمیص اور پھولدار نائیلون جالی پر مشتمل ہوگا، لیکن تراش خراش کے اعتبار سے یہ لباس (ساحاہ) کی تخلیق نظر آئے گا۔

کھڑکی سے انوری نظر آ رہی تھی - اس نے آج تو یہ کی بہت ہی چست قمیص پہن رکھی تھی - کبیری ساٹن کی قمیص جس کی کمر پر لمبی سی زپ آدھی کھلی تھی - اور اس ادھ کھلے چھر کے میں سے گندھے ہوئے آٹے جیسی سفید جلد نظر آ رہی تھی - وہ لمبی تار پر کپڑے نچوڑ نچوڑ کر ڈال رہی تھی - اور ساتھ ہی کچھ گنگناتی جاتی تھی ...

رمضان نے مرغیوں کے ڈربے کے پاس باسی روٹیوں کے کھلوندے لئے بیٹھا تھا اور ان کے چھوٹے چھوٹے بھورے کر کے مرغیوں کو دیئے جاتا تھا - ہر بار جب انوری کپڑا جھٹکتی اور پانی کی بوندیں اس پر پڑتیں تو وہ منہ بنا کر کہتا -

"اوں ہوں . . . ادھر کو کپڑے جھاڑ، ضرور میری طرف ہی بارش کریگی"

جب انوری اس کی بات کی پرواہ کرتے ہوئے پھر سے سلفچی میں سے کپڑا نکالتی، گنگناتی، اور اسے جھٹکتی تو رمضان وہیں سے چرواہے کی ہانک لگاتا، اور ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹتا - اس کھیل سے جیسے دونوں محظوظ ہو رہے تھے گفتگو کا ایک ایسا سلسلہ جاری تھا جس میں کوئی فل سٹاپ تھا ہی نہیں -

بالوں میں کان چھپا کر رشو نے اپنا برقعہ اٹھایا اور چھوٹی سی زپ لگی پلاسٹک کی تھیلی لیکر اس میں کچھ پیسے ڈالے، اور دروازے سے باہر نکل گئی۔

ارے باجی! برقعہ پہن کر پکنک پر جائیں گی آپ؟" تنویر غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے رک گئی۔

"میں تو کالج صرف اطلاع دینے جا رہی ہوں۔"

"کیسی اطلاع باجی۔"

"میں پکنک پر نہیں جا سکتی۔"

"ہائے وہ کیوں باجی!" نائٹ سوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر تنویر نے سوال کیا۔

"میں رات کو خالہ جان سے اجازت نہیں لے سکی، اس لئے۔"

تنویر ہنسنے لگی۔

اُس کے کٹے ہوئے بالوں میں لٹکے ہوئے ربن، گلابی رنگ کا نائٹ سوٹ، پیروں میں پڑی ہوئی چکوالی جوتیاں . . . سب اس کے موڈ میں شریک ہو گئیں۔

"اللہ! خالہ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ باجی! اگر بھول گئی تھیں تو شام کو بتا دیجئے گا انہیں۔ ہم تو اسی طرح کرتے ہیں۔"

"اچھا؟"

"اور کیا؟ اب کالج کی اتنی فنکشنز ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی بھول بھی جاتا ہے ان سے پوچھنا شام کو بتا دیتے ہیں انہیں۔ آپ ضرور جائیے باجی۔ کس کی فیرول ہے؟"

پروفیسر ضیاء کی۔"

"اللہ! یہ برقع تو پہن کر نہ جائیے باجی جان۔ خدا قسم اس سے تو بہتر ہے کہ آپ چادر اوڑھ لیں۔ سفید ریشمی لٹھے کی . . . اس کا بھی بہت فیشن ہے آجکل۔ میں لاؤں اپنی چادر . . ؟"

رشیدہ جو اسی جگہ رکی رہی تو یہ کچھ لٹھے کی چادر کے لئے نہ تھا۔ وہ تو کھڑی سوچ رہی تھی کہ خالہ جان سے اجازت لئے بغیر پکنک پر جانا درست بھی ہے کہ نہیں؟ بہاولپور میں چاہے کنونشن ہو جائے سالانہ اجلاس، ہفتہ بھر پہلے امی کی خوشامد کرنا پڑتی تھی۔

وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ تنویر چادر لے آئی۔

"اس لٹھے کی چادر کا بہت رواج ہے لاہور میں باجی! جو خاندان ذرا پہلے برقعے کے زیادہ پابند تھے۔ انہوں نے برقعے اتارے تو یکدم منہ سر ننگے باہر جانے کا حوصلہ نہیں پڑا۔ یہ چادر اس لئے بڑی مفید رہی . . . بڑا اسمارٹ اور با خاندانی عورتوں کا اس کا۔"

رشیدہ نے پوچھنا چاہا کہ یہ برقع اتارنے کی آخر وجہ کیا تھی لیکن تنویر کچھ ایسی روانی میں تھی کہ سوال کی پخ پھنسانے کی مہلت نہ ملی۔

"ویسے بھی باجی جو لڑکیاں لٹھے کی چادر پہن کر آتی ہیں کالج میں۔ وہ اچھے گھرانوں کی سمجھی جاتی ہیں۔ خدا قسم اتار دیجئے یہ برقع۔ اولڈ فیشن چیز . . . یا تو انسان پورا فیشن کرے یا چادر اوڑھے بس۔"

دس بجنے میں قریباً دس منٹ تھے۔ سائیکولوجی ڈیپارٹمنٹ کے لڑکے لڑکیاں

شالامار پہنچے۔ لڑکیوں میں سے کوئی بھی غیر حاضر نہ تھی۔ چھ لڑکے البتہ کم تھے۔

لڑکیوں کی ٹولی میں سے ڈمپل سب سے پیاری اور جاذب نظر لگ رہی تھی۔ اس نے سلیک نما شلوار جس کے پائنچوں میں پچ بٹن لگے تھے پہن رکھی تھی۔ قمیص میں دونوں جانب چاک نہ تھے ہپس سے نیچے پچھلی جانب البتہ ایک واکنگ ڈالکر چلنے کی سہولت کو ذرا اکھیڑا کھولا ہوا تھا۔ کمر پر عین کولہوں کے اوپر فٹ بھر زپ تھی۔ سلیٹی رنگ کی اس قمیص کی نہ تو آستین تھیں نہ ہینگر پر ٹنگی ہوئی یہ قمیص ہی لگتی ہوگی۔ اس لباس میں ڈمپل اس طرح چل رہی تھی جیسے پور ٹوا چینی عورتیں۔ بیرون چین کی عورتوں کو چینی مشاطائیں اس طور پر باندھا کرتی تھیں کہ تمام انگلیاں اندر کی جانب موڑ کر صرف انگوٹھے کو باہر رہنے دیا جاتا۔ اب انگوٹھا کبوتری کے سر سے مشابہ اور باقی پاؤں کبوتری کے دھڑ جیسا نکل آتا۔ سنا ہے جب چین میں فیوڈل نظام تھا تو وہاں کے مرد فیٹشزم کے مریض تھے۔ عورتوں کے پیروں سے ان کا جنسی تعلق اتنا گہرا تھا کہ کئی بار صرف پیر دکھا کر ہی رشتہ طے کر لیا جاتا۔

کبوتری وضع کے پیر گو چلنے میں مزاحمت کرتے تھے۔ لیکن ان کبوتروں کے سہارے چلتی عورتوں کی چال میں ایک ایسی نزاکت پیدا ہو جاتی تھی جس سے چینی مردوں کی جمالیاتی حس کو بڑا سہارا ملتا۔

ساری پارٹی پھاٹک کے اندر داخل ہو گئی۔ سب سے آگے ڈاکٹر اعجاز، پروفیسر ضیا اور پروفیسر بیگ تھے۔ ان کے دائیں بائیں ڈمپل اور طیبہ چل رہی تھیں۔ ان کے

بعد باقی پانچ لڑکیوں کی ٹکڑی تھی۔ حافظ نے آج بالکل ایک سے کپڑے پہن رکھے تھے، لڑکیوں کے بعد غازی اور ظفر کا ٹولا تھا۔ اور زیادہ سامان ان ہی کے کندھوں پر تھا۔ ساری ٹولی میانہ محل میں پہنچ چکی تھی۔ پروفیسر اعجاز اس جگہ کھڑے تھے کہ جہاں سنگ مرمر کی "چدر" موجود ہے۔ اس آبشار کی لذت زیب النسا دختر عالمگیر کے دل پر کندہ ہے۔ سنا ہے کہ وہ محل میانہ میں ہمیشہ آکر بیٹھتی اور سیر آبشار دیکھا کرتی۔ چونکہ ز، ، ور حسن و جمال کی کیفیتیں دل پر بہت گذری تھیں۔ اس لئے ٹوٹتے موتیوں کو پیروں دیکھتی اور جی ہی جی میں نہ جانے کتنے شعر کہتی۔ ایک رباعی جو ہم تک پہنچی ہے وہ یہ ہے۔

اے آبشار نوحہ گر از بہر کیستی؟
چیں بر جبیں فگندہ ز اندوہِ کیستی؟
آیا چہ درد بود کہ چوں من تمام شب
سر را بسنگ میزدی و می گریستی؟

اتنے بڑے شہنشاہ کی بیٹی اور ایسی زخم خوردہ باتیں۔ کہتے ہیں کہ سارا جھگڑا روٹی کا ہے۔ کھانے کو روٹی ملے تو پھر دکھ درد آپ ہی دور ہو جاتے ہیں۔
نہ جانے یہ کیا دکھ تھا جس نے زیب النسا کو سب کچھ ہوتے ہوئے سر زندان اور گریستن میں مبتلا کر رکھا تھا۔

پروفیسر اعجاز کی پشت آبشار کی جانب تھی، اور وہ کہہ رہے تھے۔